سہ ماہی
جی
جولائی، اکتوبر ۲۰۱۳ء / جلد نمبر ۱۱، ۱۲
جی میں کیا کیا ہے اپنے اے ہمدم
پر سخن تا بہ لب نہیں آتا
لاہور
مسئلہ امامت، امارت اور خلافت
استعمار، تاریخ اور ہماری فکر
"ریاست" کا معاصر بیانیہ!
مدیر: محمد دین جوہر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جولائی، اکتوبر ۲۰۱۳ء / جلد نمبر ۱۱، ۱۲

مشمولات

محمد دین جوہر، مدیر "جی" نے تایا سنز پرنٹرز، ریٹی گن روڈ، لاہور سے چھپوا کر حسن منزل، اردو بازار، لاہور سے شائع کیا۔

ضروری نوٹ:
اس شمارے میں قرآن حکیم کی آیات بھی شامل ہیں۔ ان کی درستی پر بساط بھر توجہ دی گئی ہے لیکن اگر کوئی غلطی رہ گئی ہو تو براہ کرم ادارے کو مطلع فرمائیں۔

سہ ماہی جی لاہور ملنے کا پتہ:
کتاب محل دربار مارکیٹ لاہور
محمد فہد: 0321-8836932

برائے رابطہ، اظہارِ رائے و استفسار:
quarterlyjee@gmail.com

قیمت: ۱۵۰/روپے

قانونی مشیر:
کامنز لا کمپنی، نوائے وقت بلڈنگ، ۴۔شارع فاطمہ جناح، لاہور

Commons Law Company, Nawa-e-Waqt Building
4-Shar'i Fatima Jinnah, Lahore

اسلام اور ریاست: جوابی بیانیے پر ایک نظر

محمد دین جوہر

ابتدائیہ

محترم جناب جاوید احمد غامدی صاحب کا مضمون ”اسلام اور ریاست: ایک جوابی بیانیہ“ ایک شہ کار صحافتی تحریر ہے۔ منجھی ہوئی بات، میڈیائی معیار فہم پر گندھے ہوئے اظہار سے مل جائے تو ایسے ہی شہ پارے تخلیق پاتے ہیں۔ سلاست، پروئے ہوئے اذعانات، ترسیلِ مطلب اور ادبی وقعت میں یہ غیر معمولی ہے۔ اس بیانیے میں ظاہر ہونے والا ادراک، اپنی دینی اور علمی، دونوں جہتوں سے تحلیل، تجزیے اور جواب کا متقاضی ہے۔ اس بیانیے کا درجۂ اثر اندازی تو جوابات اور رد عمل سے ظاہر ہے، اور جو اس موضوع کی اہمیت کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ صاحبِ بیانیہ نے ادراک اور اظہار میں اسے ایک نیزے کی طرح craft کر کے، ہمعصر سیاسی صورت حال کی نزاکتوں کو بھانپتے ہوئے، بے ڈھال اور نڈھال ہدف پر درست شست لے کر نکالا ہے اور جس طرح کے رد عمل یہ حاضر لایا ہے، ان پر خندہ زن بھی ہے۔

آنجناب کے بیانیے میں اسلام سے ایک جبری بیان لینے کی پھر سے کوشش کی گئی ہے کہ اس کا ”ریاست“ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کوشش کا آغاز انیسویں صدی کی استعماری حوالات میں، جس کے میر منشی آقائے سر سید تھے، ہوا تھا اور گزشتہ دو صدیوں میں ہم نے اسلام کی جو ”علمی خدمات“ سرانجام دی ہیں ان سے یہی لگتا ہے کہ اب اسلام سے کوئی بھی، کچھ بھی بیان لے سکتا ہے۔ ایک مکمل ہدایت اور ایک تہذیبی تصور حیات کے طور پر اسلام کی self-definition اور self-statement اب اس قدر دگرگوں ہے کہ حیاتِ انسانی کے مہمات مسائل پر اسلام کا موقف بالآخر جدیدیت اور تہذیب مغرب کی پیروی کے علاوہ کچھ سامنے نہیں آتا۔ اس کوشش کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ جدید اسلام نے اپنی توسیط کے لیے ذرائع ابلاغ کو بہت مؤثر طریقے پر استعمال کیا ہے اور جدید میڈیا کی حرکیات اور اس کی اثر اندازی کو اپنے ”علمی موقف“ کی ثقاہت کے طور پر پیش کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ یہ بات کہ اسلام کا ”ریاست“ سے کوئی تعلق

ہے یا نہیں، اس کا جواب تو علما پر واجب ہے اور وہی اس کا جواب دیں گے، اور بچارے ہاتھ پاؤں مار بھی رہے ہیں۔ ہماری معروضات اس بیانیے کے علمی اور ”فکری“ پہلوؤں تک محدود رہیں گی کہ اسلام اور جدیدیت کے افکار اور ادارہ جاتی مظاہر کے مابین جب بھی ایک تہذیبی interface بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، یا تہذیبی سطح پر کوئی فکری encounter ہوتا ہے تو اسلام لازماً کچھ علمی، فکری، شرعی اور اخلاقی جگہ چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے یا کر دیا جاتا ہے۔ بلکہ ہو یہ رہا ہے کہ اب اسلام صرف انہی مواقف کو باقی رکھنے اور ان کو اظہار دینے کے قابل رہ گیا ہے جن کی گنجائشیں غالب مغربی اور استعماری فکر اسے وقتی طور پر دینے کے لیے تیار ہوتی ہے۔ آنجناب کے بیانیے کو دیکھنے سے پہلے کچھ گزارشات تمہیداً ضروری ہیں۔

تمہیدی گزارشات

ہماری پہلی گزارش یہ ہے کہ جدید عہد کا ایک انتہائی بنیادی اور مرکزی سوال ہے، اور یہ سوال پوری جدید تاریخ کے واحد ہنکاوے (driving force) کی حیثیت رکھتا رہا ہے، اور وہ یہ ہے کہ نظریے اور سیاسی طاقت کا باہمی تعلق کیا ہے[1]؟ اس سوال کو سادہ بنایا جائے تو یہ کہ ارادے اور عمل کا کیا تعلق ہے؟ اگر اس سوال کو مذہبی رنگ میں پوچھا جائے تو یہ ہے کہ نیت اور عمل صالح کا باہمی تعلق کیا ہے؟ یا ایمان اور عمل صالح کا آپسی تعلق کیا ہے؟ مذہبی معنوں میں یہ ہمارا سوال نہیں ہے کیونکہ یہ طے شدہ ہے اور اس کے لیے کسی بیانیے کی ضرورت فی الحال نہیں پڑی ہے۔ غیر مذہبی معنوں میں یہ سوال انسانی معاشروں کا زندہ سوال ہے اور سماجی اور فلسفیانہ علوم کے اہم ترین موضوعات میں سے ہے۔ صاحبِ بیانیہ کا یہ ادعا کہ اسلام کا ”ریاست“ سے کوئی تعلق نہیں ہے، ایک ایسا جدید موقف ہے جو مستعار بھی ہے اور درآمد شدہ بھی ہے۔ پورا جدید عہد ایک موقف پر محوری گردش میں ہے کہ نظریے کے بغیر سیاسی طاقت inconceiveable ہے اس شرط کے ساتھ کہ یہ ”نظریہ“ غیر عقلی یعنی مذہبی نہیں ہو گا۔ ہمارے ہاں یہ موقف استعماری صدیوں میں درآمد اور مسلط ہوا، بلکہ یہ سوال ہمارے جسموں پر branded اور ہمارے اذہان پر کندہ ہے کہ اسلام ایک مذہب ہے اور مذہب کا ”سیاسی امور“ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس سوال کا جواب اور کندہ کار

---

[1] یہاں ضمناً یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ عصر حاضر میں ”نظام“ کی صلابت، استحکام اور ارض گیری کی وجہ سے نظریے کی اہمیت کم ہو گئی ہے کیونکہ اب نظریہ تقریباً پورے کا پورا عمل اور وجود میں ڈھل کر پوری دنیا پر قائم ہو چکا ہے۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ کامیاب نظام، نظریے کے لیے ایک کینچلی کی طرح ہوتا ہے جس میں وہ hibernate کرتا رہتا ہے۔ اور اہم تر یہ کہ نظریہ اور عقیدہ اپنی سیاسی کامیابی کے بعد کلچر بننے کی حیرت انگیز صلاحیت رکھتا ہے۔ عصری صورت حال میں مغرب کا علم ٹیکنالوجی اور ”سسٹم“ بن چکا ہے اور مغرب کے اساسی نظریات اور بنیادی مواقف کلچر بن کر انسانی زندگی کے اہم ترین مؤثرات کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

کی شناخت دونوں ہم پر ابھی تک قرض ہیں۔ آنجناب کا بیانیہ استعماری اور استشراقی دروں کاری کی محض ایک یاد دہانی ہے جس کے تجزیے کی طرف ہم تھوڑی دیر میں لوٹیں گے۔

ہماری دوسری گزارش یہ ہے کہ بیانیے کے عنوان میں "جوابی" سے کیا مراد ہے؟ یہاں جن کے لیے یہ بانکا "جوابی" سامنے لایا گیا ہے، ان کا تعین قاری کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ متبادر[۲] یہی ہے کہ "پہلے سے" کوئی بیانیہ موجود ہے جو اسلام کو ریاست سے متعلق کرنے کی دینی غلطی کا مرتکب ہوا ہے اور آنجناب کا بیانیہ اس پر استدراک ہے، جو اصل دینی موقف کو پیش کرتا ہے۔ ایک مذہبی عالم سے ایسی توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ کسی غلط دینی موقف کی اصلاح کرے۔ لیکن یہ خوش فہمی بیانیے کا پہلا فقرہ پڑھ کے ہی دور ہو جاتی ہے۔ مذہبی مدارس کے بارے میں ہمارا موقف جو بھی رہا ہو، لیکن صاحبِ بیانیہ کا پہلا فقرہ تو مفصل صحافت میں بھی ڈھونڈھے نہ ملے۔ مدارس پر سو اعتراض اٹھائے جاسکتے ہیں، ہوتے بھی رہتے ہیں اور ہو بھی رہے ہیں، لیکن اس پہلے فقرے میں کوئی علمی بات ہے نہ تاریخی بصیرت، کوئی انسانی ہمدردی ہے نہ سیاسی ادراک، ہاں بس ایک سیاسی موقع پرستی ہے جس کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا گیا۔ اس موقع پرستی سے وہ کس کو خوش کر رہے ہیں؟ یہ تو اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی عین استعماری تشویش کا اسلامی اظہار ہے۔ میں آنجناب سے یہ رہنمائی ضرور چاہوں گا کہ وہ "جدید مدرسہ" بنانے کی اپنی کوششوں کو کس تناظر میں دیکھنا چاہیں گے؟ ایسے لگتا ہے کہ جس طرح وہ مدارس[۳] سے "نجات" کے لیے "جدید مدرسہ" بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں، اسی طرح کی کارگزاری "اس کے مقابل اسلام کا صحیح فکر کیا ہے؟" کی تشکیل میں آنجناب کو حاصل رہے گی۔ ابھی اتنا عرض ہے کہ یہ بیانیہ کوئی جوابی وغیرہ نہیں ہے بلکہ یہ استعماری شاگرد پیشے کے مولود جدید اسلام کا اصلی بیانیہ ہے جو تھوڑی بہت قطع برید کے ساتھ، اور سیاسی حالات کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے، مذہبی لوگوں اور ان کے نمائندوں کے حالات کو آنکتے ہوئے، بار بار ایک ہی لانچنگ پیڈ سے داغا جاتا ہے۔ اور یہ لانچنگ پیڈ وہی پرانا سر سید کا بنایا ہوا ہے۔ اس کے انچارج اور ان کی تزویراتی حکمت عملی بدلتی رہتی ہے۔ اس پیڈ کے ارد گرد چلے ہوئے کارتوسوں اور گولوں کے خول بے شمار ہیں اور ان میں سے ہر ایک پر اس کے موجد کا نام بھی لکھا ہوا ہے اور افسوس کہ یہ نام اب ادھر ہی باقی رہ گئے ہیں۔ لگتا ہے کہ اس پیڈ کے گھورے کی آبادی کم نہ ہو گی۔ اس گھورے پر ایک بڑے سارے خالی خول پر مولوی چراغ علی کا نام بھی لکھا ہوا ہے۔ آج کتنے لوگ ہیں جو انہیں جانتے ہیں، حالانکہ وہ جدید اسلام کے اساطین میں سے تھے اور جہاد کا "مناسب بندوبست" کرنے میں انہوں نے بہت بڑا کردار ادا کیا تھا۔

۲۔ ہمارے خیال میں یہ دو قومی نظریے کا براہ راست رد ہے۔ قطع نظر اس سے کہ دو قومی نظریہ اسلام ہے یا اسلام دو قومی نظریہ ہے، پاکستانی ریاست اور مذہب کے تعلق کو یہی نظریہ بیان کرتا ہے۔

۳۔ ہم یہاں مدارس کا دفاع نہیں کر رہے، غیر جانب دار رہ کر بات کر رہے ہیں۔

موجودہ بحث کا اصل پس منظر

موجودہ بحث کے پس منظر کو جاننے کے لیے تھوڑا سا تاریخ میں جھانکنا ضروری ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں مسلم لیگ کے قیام کے ساتھ جب مسلمانوں میں سیاسی سرگرمی شروع ہوئی تو وہ کاسہ لیسی سے آگے نہیں بڑھی جب تک اسے نظریے کی کمک فراہم نہ ہوئی۔ جدید عہد میں نظریہ سیاسی طاقت کی آنکھیں ہیں اور اس کے بغیر سیاسی طاقت یا اس کے لیے جدوجہد تاریخی سفر پر روانہ ہو ہی نہیں سکتی۔ دو قومی نظریے[۴] نے مسلم لیگ کی سیاسی جدوجہد کو یہی آنکھیں فراہم کی تھیں۔ برصغیر میں مسلمانوں کی سیاسی طاقت کے لیے جدوجہد اور اس کا دو قومی نظریے سے جواز ایک ایسا جوڑ تھا جو تخلیق پاکستان کا موجب بنا۔ اس نظریے کو ۱۹۷۱ء میں بہت ضعف پہنچا اور کمزور ہوتے ہوتے بالآخر ۲۰۰۱ء میں یہ نہایت موہوم ہو گیا۔ سیاسی طاقت کا وہ نظام جس میں یہ نظریہ بامعنی تھا، ۲۰۰۱ء میں ایک نہایت بنیادی تبدیلی کے مرحلے میں داخل ہوا۔ اکیسویں صدی کا آغاز ہی اس بات سے ہوا کہ پاکستان عالمی استعماری طاقت کے نظام میں ایک epicentre کی حیثیت اچانک اختیار کر گیا۔ ہمارے سیکیورٹی اداروں کی غیر معمولی کارکردگی کی وجہ سے پاکستان سلامتی کی جدوجہد میں کامیاب رہا۔ استعماری ایجنڈے کے علی الرغم، بطور ملک پاکستان کی سالمیت کی وجہ سے یہاں قائم طاقت کا علاقائی اور عالمی نظام ایک بہت بڑی tectonic shift کے مرحلے میں ہے۔ تاریخ میں طاقت کا نظام صرف جنگ کے نتیجے میں تبدیل ہوتا ہے، اور افغانستان میں استعماری جنگ چونکہ اپنا مطلوبہ مقصد، جو پاکستان کی سالمیت کو ختم کرنا تھا، حاصل کرنے میں ناکام رہی ہے، اس لیے یہاں قائم طاقت کے بین الاقوامی نظام میں بہت ہی گہری adjustments وقوع پذیر ہیں۔ طاقت کے نظام میں اساسی تبدیلی کی وجہ سے دو قومی نظریہ اس وقت بحران کا شکار ہے، اور طاقت کے عصری نظام سے ہمقدم نہ ہونے کی وجہ سے اسے irrelevance کا خطرہ لاحق ہو گیا ہے، کیونکہ اس وقت سیاسی طاقت یعنی پاکستانی ریاست اور نظریے کا عدم توازن بالکل عیاں ہے۔

دو قومی نظریہ[۵] جس "دیگر" کے مقابل میں متشکل ہوا تھا، وہ ہندو تھا، اور مسلمانوں کو اس کے مقابل کھڑے ہونے اور کھڑے رہنے کا سیاسی اور قومی جواز فراہم کرتا تھا۔ ۲۰۰۱ء میں افغانستان پر استعماری حملے سے پاکستانی ریاست اور دو قومی نظریے کا "دیگر" اچانک تبدیل گیا۔ دو قومی نظریے کی تخلیق کے وقت استعمار کا بیان یا اس کی شناخت، جو اس وقت کی سب سے بڑی تاریخی حقیقت تھی، اس میں سے محذوف تھا۔ نظریہ ایک آنکھ سے طاقت اور دوسری آنکھ سے تاریخ کو دیکھتا ہے۔ اپنی پیدائش کے تاریخی لمحے میں

۴۔ راقم یہاں دو قومی نظریے کا کوئی تجزیہ وغیرہ نہیں کر رہا بلکہ ایک سامنے کی بات عرض کر رہا ہے۔
۵۔ ہم "نظریے" کی تفصیلی بحث کو سردست کسی اور موقعے کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔

دو قومی نظریے نے استعمار سے اغماض برتا، اور ۲۰۰۱ء کے بعد اچانک وہی استعمار جب افغانستان میں آ براجا اور نظریے کی دوسری آنکھ مجبوراً کھلی تو اندازہ ہوا کہ یہ نظریہ پوری بینائی نہیں دے پا رہا۔

افغانستان میں استعماری موجودگی کے ساتھ دوسرا افسوسناک واقعہ یہ ہوا کہ ایک اقتصاری اسلام، جو نظریاتی لحاظ سے مکمل طور پر استعمار کی ترجیحات پر گھڑا گیا ہے اور جس کے ریشے استعماری غلامی کی شب ظلمت میں ہمارے معاشروں میں نمودار ہوئے تھے، اچانک ایک طاقتور عامل کی حیثیت سے نمودار ہوا اور استعمار کی مکمل پشت پناہی میں پاکستان کے خلاف جنگ کے ہراول کا کام کرنے لگا۔ ان تاریخی حالات کی حربی حرکیات نے دو قومی نظریے پر، اور استعماری طالبان نے فی نفسہٖ اسلام پر بڑے بڑے سوال وارد کر دیے ہیں۔ یعنی وہی استعمار جو ۱۹۴۷ء میں ہمارا دوست تھا، اور وہی اسلام جو اس ملک کی وجہ تخلیق تھا، دونوں باہم مل کر ۲۰۰۱ء میں اس ملک پر حملہ آور تھے اور اسے مٹا دینے کے درپے تھے۔ اس صورت حال کی وجہ سے دو قومی نظریہ اور اسلام دونوں ہی زبردست بحران کا شکار ہو گئے، اور وہ لوگ جو دو قومی نظریے کے چھابڑی فروش تھے وہ بھی اس کے بارے میں شکوک و شبہات کا شکار ہو گئے ہیں۔ اس طرح دو قومی نظریے پر زبردست دباؤ پیدا ہوا اور اسلام کی نئی اور جدید تعبیرات کی تلاش میں بھی زیادہ شدت پیدا ہو گئی۔ اس بحران کی وجہ سے ایک لبرل اور سیکولر ریاست کے قائلین یہ سمجھتے ہیں کہ اب دو قومی نظریے اور اسلام سے معاملہ صاف کیا جا سکتا ہے یا ان کا معاملہ صاف کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام اور ریاست، اسلام اور قومیت، اسلام اور خلافت، وغیرہ جیسے موضوعات پر گفتگو پھر زور شور سے شروع ہوئی ہے، تاکہ اسلام کو اجتماعی عمل اور فکر کے ہر دائرے سے خارج کر دیا جائے۔

اسلام اور ریاست / اسلام اور فکر

اب ہم آنجناب کے "جوابی بیانیے" کو دیکھنے کی کوشش کریں گے۔ ہم ابھی یہ بحث اٹھا رکھتے ہیں کہ بیانیہ (narrative) کیا ہوتا ہے، اس کی تشکیل اور تجزیے کی شرائط کیا ہیں، ادب، سماجی علوم اور فلسفے میں بیانیہ کیا معنی رکھتا ہے، اور اہم تر یہ کہ الوہی ہدایت کو بیانیے کی پتلون پہنائی جا سکتی ہے یا نہیں؟ اور پھر یہ کہ بیانیہ (narrative) اور مبحث (discourse) کے امتیازات کو مٹا کر جدید اسلام اپنے ایجنڈے کو کس طرح آگے بڑھاتا ہے۔ ہم آنجناب کی تحریر کے عنوانی self-statement کی رعایت رکھتے ہوئے ان کی گفتگو میں شریک ہونے کی کوشش کریں گے۔

آنجناب کا بیانیہ ایک تعارفی پیراگراف اور پھر اس پر مرتب ہونے والے دس اہم نتائج پر مشتمل ہے۔ صاحبِ بیانیہ نے اسلام کے "درست" موقف کو جن نتائج کی شکل میں پیش کیا ہے، ان کا جواز

"اسلام کے صحیح فکر" سے فراہم ہوتا ہے۔ "اسلام کے صحیح فکر" ہی کی روشنی میں انہوں نے اسلام اور ریاست کے تعلق کو بھی متعین کیا ہے۔ آنجناب کے بیانیے کا دار و مدار اور مرکزی نکتہ یہ ہے کہ وہ "اسلام کا صحیح فکر" رکھتے ہیں جس کی بنیاد پر وہ ان بیان کردہ نتائج تک پہنچے ہیں۔ صاحبِ بیانیہ سے صرف ایک بنیادی سوال زیر بحث لانے کی ضرورت ہے، اور وہ یہ ہے کہ:

اگر اسلام اور ریاست کا تعلق زیر بحث لایا جا سکتا ہے تو اسلام اور فکر کے تعلق کو کیوں زیر بحث نہیں لایا جا سکتا؟

اسلام اور ریاست کے باہمی تعلق کا سوال ضمنی ہے، کیونکہ اس کا معرف تو وہ فکر ہے جسے اس تعلق پر حکم کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ اسلام اور فکر کے باہمی تعلق کو طے کیے بغیر، اسلام اور ریاست یا اس طرح کے بیسیوں دیگر موضوعات کو زیر بحث لانا متجددین کی خاص tactic ہے۔ اصل سوال وہی ہے جو ہم نے عرض کر دیا اور اس پر تین سوالات ضمنی ہیں:

۱۔ فکر سے کیا مراد ہے؟ اور کیا صاحب بیانیہ کا "صحیح اسلامی فکر" سرے سے کوئی فکر ہونا qualify بھی کرتا ہے یا نہیں؟ اسلام سے الگ اس فکر کا مبسوط بیان کیا ہے؟ انہوں نے بزعم خویش "اسلام کے صحیح فکر" کی تطبیقات بیان کی ہیں، فکر کی تفصیل محذوف ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کا بیان کیا ہے؟

۲۔ اگر یہ کوئی فکر ہے، تو انہوں نے اس کے صحیح اور اپنے مقابل کے فکر پر غلط ہونے کا فیصلہ کن بنیادوں پر دیا ہے؟

۳۔ تیسرا ضمنی سوال اہم تر ہے کہ اپنے فکر کے "اسلامی" ہونے کا فیصلہ انہوں نے کن بنیادوں پر کیا ہے، اس سے پیشتر کہ اس کا فکر ہونا ثابت ہو؟

کم از کم برصغیر میں ہمارے متجددین کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ مذہب پر "فکر" کو نافذ کرتے ہیں، اور فکری امور پر مذہب کو لاگو کرتے ہیں، اور مذہب سے الگ اس فکر کا کوئی بیان کہیں موجود نہیں ہے۔ مذہب پر بات کرتے ہوئے اس فکر کا طنطنائے ہوئے رہنا، اور مغربی فکر پر بات کرتے ہوئے اس کا گھگھیائے ہوئے رہنا معمول ہے۔ ہمارے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے متجددین دراصل فکر مغرب تو کجا، فکر ہی سے قطعی نابلد ہیں، اور مغرب کے سیاسی، معاشی اور علمی غلبے کی وجہ سے جو مغربی اور الحادی تلچھٹ کلچر میں داخل ہو کے اذہان اور رویوں کا حصہ بن جاتی ہے، اسے ہی یہ "فکر" قرار دے کر "اسلامی" بنانے کی فکر مندی میں لگے رہتے ہیں، حالانکہ وہ "فکر" پہلے سے قائم ہو چکی ہوتی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ کلچر کے ہم قدم رہنے سے دام اچھے لگتے ہیں اور اجرت اچھی ملتی ہے۔ مغربی علوم و ثقافت کی تلچھٹ کی وسیع پیمانے پر اشاعت اور

قبولیت کو یہ اپنے "فکر" کی قبولیت کے ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اگر ہمارے متجددین مغربی فکر کے مباحث سے واقف ہوں تو افکار اور ثقافتی اثرات کے نسب کا درست اندازہ ہو جاتا ہے، اور ان کی شناخت کرنا مشکل نہیں رہتا۔ لیکن اس سے بڑی مشکل یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ پھر ان کو "اسلامی" بنانے کا منصوبہ آگے بڑھانا آسان نہیں رہتا۔

ایک مثال سے بات صاف ہو جائے گی۔ یہ بات کہ مذہب کا "ریاست" سے یا درست تر معنوں میں سیاسی نظام اور "ریاست" کے قانون سے، معاشرے کی تشکیل سے، معاشی نظام کے قیام سے، علم سے، تعلیم سے، کلچر سے، غرض کسی چیز سے کوئی تعلق سرے سے ہی نہیں ہے، یہ بات تو مغرب اور اس کے علوم و افکار گزشتہ تین سو سال سے نہ صرف چلا چلا کے کہہ رہے ہیں بلکہ یہ افکار اور ان کی بنیاد پر بننے والے ادارے مغرب نے بذریعہ استعمار و استشراق پوری دنیا میں پھیلا بھی دیے ہیں[6]۔ اگر کوئی کہے کہ مغرب کا بطور تہذیب یہ موقف نہیں ہے تو یہ بے خبری، ہٹ دھرمی اور جہالت کی بات ہے[7]۔ سوال یہ ہے کہ آخر مغرب کی اور استعمار و استشراق کی یہی گھسی پٹی بات اب "اسلام کے صحیح فکر" سے کہلوانے کی کیا ضرورت باقی رہ گئی تھی[8]؟ اور یہ بات تو اس "صحیح اسلامی فکر" کی مدد کے بغیر ہی پوری دنیا کو معلوم ہے، اور پوری دنیا اسی پر عامل بھی ہے[9]۔ یہ بات جانتے ہوئے کہ جدید عہد میں انسانی زندگی کے سماجی، تعلیمی، علمی، ثقافتی، معاشی، قانونی، اور سیاسی مؤثرات، یہاں تک کہ انسان کی انفسی تشکیل کے تمام تر ذرائع اب جدید ریاست کے مکمل ترین کنٹرول میں ہیں، محض یہ سوال اٹھانا اور فتویٰ دینا کہ اسلام کا ریاست سے کوئی تعلق نہیں، ایک نہایت افسوسناک سطح کی فکری کارگزاری ہے اور علمی دیانت کے ہر اصول کے

۶۔ مابعد ۱۸۵۷ء جہاد پر ہونے والی تمام بحثوں میں اصل سوال یہی ہے کہ مذہب کا ریاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۷۔ TheEnlighenmentProject کا پورا ایجنڈا ہی یہ ہے کہ مذہب کا تاریخ، معاشرے، معاش، علم اور فن کے مؤثرات سے قطعی کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ قائم کیا جا سکتا۔

۸۔ سر سید عین استعماری اور مغربی مرادات کو "نصوص" سے ثابت کرتے تھے۔ یہی کام صاحب بیانیہ کر رہے ہیں۔ جدید ریاست انسانی تاریخ کا واحد حاوی حیات مظہر ہے، اور یہ خود اپنے علاوہ انسان کا ہر دوسری چیز سے تعلق مکمل طور پر منقطع کر دیتی ہے، یہاں تک کہ انسان کا اپنی خودی (self) سے بھی کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ جدید انسان اپنی حیات اور خودی دونوں کے لیے جدید ریاست پر مکمل طور پر dependent ہے اور بقول ہابرماس فرد جدید ریاست میں embedded ہے۔ انسان کا مذہب سے انقطاع جدید ریاست کی وجودیات اور فعلیت سے از خود حاصل ہو جاتا ہے۔ اگر فکری مباحث سمجھ میں نہیں آتے تو چلو آدمی تجربے ہی سے کچھ سیکھ لے۔ جدید مغرب میں انسان کی صورت حال کو دیکھ کر بھی ہمارے جدید علما اور دانشوروں کو سوائے سڑکوں کی لمبائی چوڑائی اور عمارتوں کی بلندی پستی سے آگے کبھی کچھ نظر نہیں آیا۔

۹۔ مسلمانوں کو سیکولر بنانے، استعمار کی گماشتہ گیری سکھانے اور "روح محمد [ﷺ] ان کے بدن سے نکال دو" کا مقصد حاصل کرنے کے لیے متجددین نے اسلامی نصوص ہی کو نہایت چابک دستی سے استعمال کیا ہے۔ اگر دین کو مندرس کہہ کر ترک کرنے، اور سیکولرزم کو اختیار کرنے کی بات صاف صاف کی جائے تو مسلمان بدک جاتے ہیں اور ایجنڈا کارگر نہیں رہتا۔

خلاف ہے"[10]۔ اگر آنجناب کی "صحیح اسلامی فکر" میں "فکر" ہونے کی کوئی ایک شرط بھی پائی جاتی، تو انہیں یہ معلوم ہونا چاہیے تھا کہ آج کے دور میں یہ کہنا کہ اسلام کا ریاست سے کوئی تعلق نہیں ہے، یہ معنی رکھتا ہے کہ اسلام کا کسی بھی چیز سے کوئی تعلق نہیں۔ اب اسلام اور مسلمانوں کے نصیب میں اسی طرح کے بیانیے رہ گئے ہیں۔

آنجناب نے جدید ریاست اور حکومت کے بارے میں جس طرح کے ارشادات فرمائے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان کی اساسی اور تشکیلی فکر سے قطعاً ناواقف ہیں، اور لطف یہ کہ نافہمی کا طعنہ دوسروں کے لیے مخصوص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے سیاسی طاقت کے جدید تصورات اور ریاست، حکومت اور جمہوریت وغیرہ کی صورت میں ان کی تشکیل پر کوئی فکری بحث نہیں چھیڑی۔ ہم صرف یہ واضح کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ وہ اپنے "فکری" مہروں کی بساط کس طرح پھیلاتے ہیں۔ ریاست اور حکومت جدید علم اور فکر کے بہت بڑے موضوعات ہیں اور آنجناب کے واعظانہ اسلوب، صحافیانہ تدوین گری، موقفانہ ادل بدل اور مکتبی تحقیقات سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی "فکر" ابھی تک "قطعی الدلالہ" ہی کی مجاور بنی ہوئی ہے اور اسے فرصت نہیں ملی کہ دوسرے علمی اور فکری موضوعات پر داد سخن دے سکے۔ یہی وجہ سے کہ آنجناب "ریاست" اور "حکومت" پر فتویٰ دینے کے لیے بہت عجلت میں دکھائی دیتے ہیں، لیکن ان کی "فکر" پر گفتگو سے گریزاں ہیں۔ جدید فکر کے تناظر میں "ریاست" اور "حکومت" سے ان کی مراد نہایت نجی اور ذاتی نوعیت کی ہے، جس کا جدید فکری مباحث سے کوئی تعلق سرے سے ہی نہیں ہے۔ "ریاست" اور "حکومت" پر فتویٰ تو مذہبی معاملہ ہے جو علما کا دائرہ کار ہے ہمیں اس میں کوئی دخل بھی نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان کا "صحیح اسلامی فکر" ریاست اور حکومت کے پورے جدید فکری تناظر سے مکمل حالتِ انکار میں کیوں ہے؟ ریاست اور حکومت غیر مذہبی علم، اور ہم عصر تناظر میں، مذہب دشمن مغربی فکر کا ایک نہایت اہم موضوع ہے۔ دیانت داری یہ تقاضا کرتی ہے کہ ان موضوعات کو مذہب سے جوڑنے سے پہلے یا غیر مذہبی فکر کو مذہب پر مسلط کرنے سے پہلے اس کا بیان ازبس ضروری ہے، اور جو آنجناب کے ہاں قطعی مفقود ہے۔

ہماری گزارش ہے کہ دنیا کی ہر تہذیب، ہر مذہب اور نظام افکار اپنا ایک self-statement رکھتا ہے، اور اس self-statement کو من و عن مان کر ہی گفتگو کا آغاز ہو سکتا ہے، یعنی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مغربی تہذیب کا self-statement ہم بدھ تہذیب سے حاصل کریں گے یا یہ کہ مغربی تہذیب یہ

۱۰۔ سترھویں صدی میں جدید ریاست تشکیل کے ابتدائی مراحل میں تھی جب ٹامس ہابس نے اسی نام کی کتاب میں اسے Leviathan قرار دیا تھا۔ اب تک تو اس پر گفتگو بہت آگے بڑھ چکی ہے۔

بتانے کا حق نہیں رکھتی یا نہیں بتا سکتی یا نہیں بتایا کہ وہ کیا ہے، یا یہ کہ اسلام کا self-statement ہندو مت سے حاصل ہو گا۔ یا یہ کہ مغربی تہذیب کا self-statement آنجناب کے فتوے سے حاصل ہو گا۔ ہماری گزارش ہے کہ مغربی تہذیب بھی اپنا ایک self-statement رکھتی ہے[11] جو اس کے پورے نظام افکار اور تہذیبی اداروں کو محیط ہے، مثلاً جدید ریاست، جدید طرز حکومت، جمہوریت، سیاسی طاقت کے نظریے، اخلاق کے تمام مباحث، معاشی نظام اور اس سے وابستہ فکریں، نظریۂ ارتقا، سائنس، کوانٹم فزکس، انسان اور کائنات کے آغاز و انجام پر بنیادی مواقف، علم، ٹیکنالوجی، آرٹ اور فن وغیرہ، یہ سب مغرب کے ادارے اور افکار ہیں، اور ان پر گفتگو سے پہلے جیسے وہ بیان کیے گئے ہیں، ویسے ان کا سمجھنا ضروری ہے۔ رد و قبول دوسرا مرحلہ ہے۔ مباحث کی حرمت فکری گفتگو کی شرط اول ہے، رد و قبول کی بنیاد بھی یہی ہے۔ مثلاً جمہوریت کے رد و قبول کا اختیار ہر کسی کو ہے، لیکن جمہوریت سے یہ مراد نہیں لیا جا سکتا کہ یہ روزے رکھنے کا ایک پورا نظام ہے یا آنجناب کے واعظانہ افکار و ملفوظات کا مجموعہ ہے۔ ہر فکر کا درست بیان اس پر حکم لگانے سے پیشتر ہے۔ اگر ہم جمہوریت کو اپنے کوئی معنی پہنانا چاہتے ہیں تو اس پر بھی کسی کو اعتراض نہیں، لیکن شرط یہ کہ پہلے سے موجود موقف کا علمی رد کیا جائے۔ ایک سانس میں ایک آیت پڑھ کے اور دوسرے سانس میں یہ نعرہ بلند کرنا کہ ”یہی جمہوریت ہے“ نہ دین کی مراد کو پورا کرتا ہے، نہ فکر کے علمی اور عقلی تقاضے پورا کرتا ہے۔ ہماری گزارش یہ ہے کہ آنجناب جمہوریت یا ریاست پر کسی گفتگو کا آغاز کریں تا کہ ہمیں بھی ان کے فکری تناظر کا اندازہ ہو۔ فتویٰ کا کام تو وہ جب چاہیں کر سکتے ہیں۔

مغربی تہذیب سیاسی طاقت کا ایک بہت واضح تصور اور اس کی تشکیل کے بیسیوں طریقے اور ادارے رکھتی ہے۔ استعمار کے تعلیمی اداروں نے، اور خاص طور پر آقائے سرسید نے، ہمارے ذہنوں میں یہ بات راسخ کر دی تھی کہ مغربی تہذیب نے اپنے اصول و مبادی قرآن مجید ہی سے لیے ہیں اور اسلام اور عیسائیت، اور اسلام اور استعمار میں کوئی فرق نہیں ہے تا کہ آگے چل کر اس طرح کے بیانیے گھڑنا ایک مستقل دانشورانہ اور عالمانہ سرگرمی بن جائے۔ تہذیبوں کے مابین تعامل اور اخذ و ادا تاریخ کا ایک معمول اور بہت سطحی چیز ہے۔ لیکن کوئی تہذیب کسی دوسری تہذیب کا تصور حیات اور بنیادی حقائق مستعار نہیں لیتی۔ آخر صاحب بیانیہ کی فکر اس بات سے کیوں گریزاں ہے کہ وہ مغربی تہذیب میں سیاسی طاقت کے تصور اور تشکیل کو زیر بحث لائے تا کہ یہ واضح ہو کہ وہاں فکر کس طرح کام کرتی ہے اور کس طرح نتائج نکالتی ہے، اور کیا وہاں بھی فکر ”یہی جمہوریت ہے“ کہہ کے کام چلاتی ہے؟ اور یہ کہ جدید افکار اور ادارے مغرب کی اساسی فکر سے کس طرح جڑے ہوئے ہیں؟

۱۱۔ ہم اس کے صحیح یا غلط ہونے کی بات نہیں کر رہے۔

گزراش ہے کہ مشہودات کے حسی ادراک کی بنیاد پر بننے والے عقل کے انتاجات اور مواقف کے مجموعے کو فکر کہتے ہیں۔یہاں عقل سے مراد صاحب بیانیہ کی عقل نہیں ہے، بلکہ انسانی عقل ہے جس میں افلاطون بھی شامل ہے اور غزالیؒ بھی، اور ہمیں شک ہے کہ اس میں صاحب بیانیہ کا نام و نشان بھی مل سکے۔ پورے جدید علم میں فکر سے یہی مراد ہے۔ جدید علم اور فکر کی بحث میں ایک نکتہ مرکزی ہے کہ علم اپنی منہج میں، غایت میں اور حدود میں مکمل طور پر عقل ہی پر منحصر ہو گا۔ آنکھوں کے دیکھنے کی شرط اول ہے کہ وہ کسی کھوپڑی میں نصب ہوں۔ عقل کی کھوپڑی کل شعور ہے، اور کل شعور کی اساس علم نہیں ہے، وہ کچھ مانی ہوئی چیزیں ہیں۔ فرض کیا اگر کوئی انسان یہ مانتا ہے کہ کائنات خود بخود وجود میں آئی ہے تو عقل کی تمام کارگزاری اس تعین سے باہر نہیں جا سکتی۔ عقل کا گھر اور منزل ایک ہوتی ہے۔ عقل ہر مرحلے پر اسی بات کے شواہد جمع کرے گی اور اس کا آخری انکشاف بھی یہی ہو گا کہ کائنات خود بخود وجود میں آئی ہے۔ عقل اساسات شعور کی تصدیقات قائم کرنے کا نام ہے، بھلے یہ تصدیقات شعور کے اندر ہوں یا باہر۔ صرف عقل کو رہنما بنانا جدید انسان کا فیصلہ ہے، اور اپنی عقلی کارگزاری کو صرف مشہودات تک محدود رکھنا بھی اس کا بنیادی فیصلہ ہے تاکہ وحی کو ماننے کی کھکھیڑ سے بچا جا سکے۔ حصول علم کے لیے جدید انسان کا عقل پر مکمل انحصار اور مشہودات کی قید دراصل انکار وحی کا اعلان ہے۔یہیں سے مذہبی آدمی کے لیے ایک ایسا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے جس کا کوئی تشفی بخش فکری حل سامنے نہ آنے کی وجہ سے دنیا کے تمام مذاہب آہستہ آہستہ انفس و آفاق سے غائب ہو گئے یا صاحب بیانیہ کی فکر سے ملتی جلتی علمی کم نظری کی وجہ سے مکمل طور پر جدیدیت کے تابع ہو کر اپنی شناخت ہی باقی نہ رکھ سکے۔ مذہبی آدمی کو ایسی فکر کی ضرورت ہے جو ایک طرف عقلی اور علمی ہونے کی شرائط کو پورا کر سکے اور دوسری طرف وحی سے تعلق کو اپنی کلیت میں باقی رکھ سکے۔ یہ وہ کام ہے جو غزالیؒ نے کیا تھا، اور صاحبِ بیانیہ نے اپنے چند تعارفی جملوں میں مکمل کر لیا، یعنی استشراقی پس خوردہ جات کو نہ صرف ”فکر“ قراد دیا بلکہ اسے خود ہی ”صحیح“ کہہ لیا اور خود ہی اس کے ”اسلامی“ ہونے کا دعویٰ بھی کر دیا۔ عجلت دراصل تطبیقات کی ہے تاکہ استعماری آقا اور اس کا شاگرد پیشہ خوش ہو جائے!یہیں سے ان کے فکری اور مذہبی شعور کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ جو آدمی فکر اور مذہب کے امتیاز ہی سے بے خبر ہو، اور جس کی فکر کا اظہار حرفِ معدولہ کی صورت ہو، اور اس کا شوقِ تطبیقات سائن بورڈ کی طرح آویزاں ہو، اس کی علمی دیانت کس حد تک قابل بھروسہ ہے؟

حسی ادراک کی نارسائی کا مداوا عقل کی نظری کارگزاری سے حاصل ہوتا ہے۔ جس طرح حسی ادراک کی نارسائی ہمارے تجربے میں ہے، بعینہٖ عقلی انتاجات اور مواقف کی نارسائی، بوداپن اور عدم استقلال

بھی انسانی تجربے میں ہے۔ اس کا مداوا کیا ہے؟ مغربی انسان بضد ہے کہ کوئی نہیں۔ بطور مسلمان ہمارا موقف یہ ہے کہ عقلی ادھورے پن کا مداوا وحی ہے۔ اگر حس کو آنکھ عقل سے ملتی ہے تو عقل کو آنکھیں وحی سے ملتی ہیں۔ یہ باتیں تو مباحث میں نمٹائی جاتی ہیں، فتویٰ سے حل نہیں ہوتیں۔ یعنی یہ بات بہت بعد کی ہے کہ ریاست مذہبی ہو سکتی ہے یا نہیں، اول سوال یہ ہے کہ "ریاست" ہوتی کیا ہے اور اس کا جواب ہر گز قرآن مجید سے تلاش نہیں کیا جائے گا، کیونکہ یہ غیر مذہبی علم کا موضوع ہے۔ اگر کوئی چیز بیک وقت مذہبی اور غیر مذہبی علم کا موضوع ہے تو غیر مذہبی علم میں رہتے ہوئے اس کے اساسات متعین کرنا اول کارگزاری ہے۔ اسی طرح جب غیر مذہبی علم میں رہتے ہوئے ریاست کی بحث مکمل ہو گی تو ان انتاجات پر مذہب کو حکم کے طور پر لایا جائے گا۔

ہمیں مغربی فکر پر گفتگو کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے، لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ:

تازہ پھر دانش حاضر نے کیا وہ سحر قدیم
گزر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوب کلیم

پورا جدید علم فکر کی ابولہبیانہ تشکیل ہے۔ اگر فوری فوری آیات پڑھ کے ان کی آڑ میں جدید فکر کو deploy کیا جائے تو اس کے "اسلامی" ہونے کا التباس پیدا ہو جاتا ہے۔ ہمارا مطالبہ صرف یہ ہے کہ فکر کی گفتگو فکر کی شرائط پر ہو، اور جدید فکر کو مذہبی نقاب کے بغیر سامنے لایا جائے۔ جدید فکر کے بارے میں یہ بتانا ثانوی اہمیت رکھتا ہے کہ وہ اسلامی ہے یا غیر اسلامی۔ اول اہمیت اس بات کی ہے کہ وہ ہے کیا اور کن اساسی بیانات پر استوار کی گئی ہے۔ ایک سانس میں جدید فکر کے مواقف بیان کر کے دوسرے سانس میں آیت پڑھ کے ان کے درمیان صحافتی تلازمات پیدا کرنے سے کوئی فکری اور دینی شرط پوری نہیں ہوتی۔

ہمارے متجددین کی کوششوں سے "صحیح اسلامی فکر" کا کام ماشاء اللہ اس حد تک آگے بڑھ گیا ہے اور اسلام جدیدیت کے سامنے اس حد تک تسلیم و رضا کی صورت اختیار کر گیا ہے کہ اب یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ اسلام نے متجددین کے فیصلوں پر سر بھی ہلایا ہے یا نہیں۔ لیکن "اسلام کا صحیح فکر" یہی کہتا ہے کہ اسلام کا ریاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انسانی معاشروں میں سیاسی طاقت کی موجودگی تاریخ کے natural order کا حصہ ہے، لیکن سیاسی طاقت کی بطور تنظیمی ریاست[12]، جمہوری حکومت[13]، ابلاغ عامہ[14]، تفوق

-12 organizational state;
-13 democratic government
-14 mass media

کلچر[15] اور مہجوری علم[16] تشکیل ایک بالکل جدید چیز ہے۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ اسلام اور نئی چیزوں کے باہمی تعلق پر داد فکر دی جائے، لیکن اس شوق سے پہلے ان کی فہم حاصل کرنا ضروری ہے۔

جدید ریاست پر گفتگو کی ایک "فکری" منہج تو آنجناب کے بیانیے میں دکھائی دیتی ہے۔ یہ "فکری" تو محض نام نہادی ہے، دراصل اس میں "فکر مندی" پائی جاتی ہے کہ عصر حاضر کی کوئی چیز "اسلامی" ہونے سے رہ نہ جائے:

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

ہمارے متجددین اپنا بستہ اٹھا کے پھرتے رہتے ہیں، اور اس بستے میں کتابیں اب کتنی باقی رہ گئی ہوں گی، وہ سب کے علم میں ہے۔ یہ بستہ اسٹکروں سے بھرا ہوتا ہے اور قلم کان پر دھرا رہتا ہے، جو چیز راہ میں نظر آتی ہے اس پر اسٹکر لگاتے چلے جاتے ہیں اور نیچے اپنے دستخط ثبت فرماتے ہیں تاکہ سند رہے۔

"فکر" یا پالیسی

آنجناب کے ہاں مذہبی تو دور کی بات ہے، کسی فکر کا کوئی سراغ ہی نہیں ملتا۔ ہاں ایک چیز ضرور ہے اور اس کے لیے ہم بھی آنجناب کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ جسے وہ "فکر" کہہ رہے ہیں، وہ دراصل "پالیسی" ہے۔ آنجناب کی پوری کی پوری لفظیات، دلیل سازی، طریقۂ کار، follow-up اور cover-up "پالیسی" کو چلانے کے سیاسی طریقۂ کار سے سو فی صد مستعار اور مشابہ ہے، یعنی جسے وہ "فکر" کہہ رہے ہیں اس کی فعلیت مکمل طور پر policy paradigm میں سامنے آ رہی ہے۔ "پالیسی" کو "فکر" کہنا بھی پالیسی کا حصہ ہوتا ہے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد امریکی صدور پالیسی بیان جاری کرتے ہوتے ہیں، اور ایسے بیانات کو doctrine کہا جاتا ہے۔ یہ کوئی فکر نہیں ہوتی، اور انہیں doctrine محض تفریح طبع کے لیے کہا جاتا ہے، تاکہ عوام خوش و خرم رہیں کہ انہیں بھی فکری معاملات میں درک حاصل ہے۔ اسی طرح آنجناب اپنی پالیسی کو "اسلام کا صحیح فکر" قرار دے دیں تو کون پوچھ سکتا ہے؟ جب طاقت کے پیراڈائم اور کارپوریٹ مفاد کے "قران السعدین" میں اسلام کو طلب کر کے پوچھا جائے کہ بتاؤ جدید جمہوریت کے بارے میں کیا موقف رکھتے ہو تو یہی "صحیح اسلامی فکر" کی ولادت باسعادت کی گھڑی ہوتی ہے۔ اور ایسے قران السعدین میں پیدا ہونے والی "پالیسی" کو "فکر" کا نقاب بھی میسر آ جائے تو اس کا راستہ

15- hegemonic culture
16- from Luciferian reason alone

بھلا یہ کس مسلمان کیسے روک سکتے ہیں؟

فکر، بھلے مذہبی ہو یا غیر مذہبی، اس کا بنیادی تناظر "سچ" یا "حق" ہوتا ہے، اور اس میں عقلی فعالیت دلائل کی صورت میں سامنے آتی ہے یعنی فکر اس علم کو کہتے ہیں جو یہ اپنے "سچ یا حق" کے اظہار، ابلاغ اور دفاع کے لیے بناتی ہے۔ پالیسی کا تناظر "سیاسی طاقت" یا "کارپوریٹ" مفادات ہوتے ہیں، اس لیے پالیسی نعرے اور سلوگن بناتی ہے۔ فکر تفصیل میں جاتی ہے، بال بال کی کھال ادھیڑتی ہے، دلائل اور رد دلائل کا طومار باندھتی ہے۔ اشاعرہ اور معتزلہ کے مباحث اٹھا کے دیکھ لیجیے، یا کسی بھی جدید موضوع پر امریکی یا یورپی پروفیسروں اور عالموں کے مباحث دیکھ لیں، عقل کا طریقۂ کار ایک ہی ہے بھلے وہ مذہبی عقائد کے دفاع میں نکلے یا غیر مذہبی مواقف کے لیے دلائل لائے۔ اس طریقۂ کار میں اہم یہ ہوتا ہے کہ چیزوں میں علمی امتیازات قائم کیے جائیں تاکہ ان کی اصل حیثیت سامنے آ سکے، ان امتیازات کو واضح رکھا جائے، اور اپنے موقف کے لیے عقلی دلائل فراہم رکھے جائیں۔ پالیسی سطحی مماثلتوں کو طوطے کی رٹتے رہنے، امتیازات کو مٹانے، اور ماٹو، نعرے اور عوامی موڈ کے مطابق سلوگن کی fog تخلیق کرنے اور انہیں بار بار دہرانے سے آگے بڑھتی ہے، تاکہ اصل بات اور ایجنڈے کا پتہ ہی نہ لگ سکے۔ آپ دیکھیں کہ آنجناب سالہا سال سے ایک دو باتوں کو کس شدومد سے سو رنگ سے دہرا رہے ہیں۔ اب میڈیا پر آ کے آنجناب کی بات نوشتۂ دیوار بن گئی ہے۔ پرانے زمانے نوشتۂ دیوار واقعاتی اور تقدیری بات کو کہتے تھے، اب اشتہار کو کہتے ہیں۔ آنجناب کو جواب دینے والے ہمارے ممدوحین یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ شاید کوئی علمی یا فکری بات فرما رہے ہیں، اور کچھ احباب نے تو ان کے بیانیے کا علمی جواب دینے کی کوشش بھی کی ہے۔ وہ یہ بھول ہی گئے کہ پالیسی کی بھینس کے آگے فکری بین بجانے سے لے بھی خراب ہو جاتی ہے۔ ہم تو مضافاتی آدمی ہیں ان کی پالیسی ہی کے سحر سے نکل نہیں پاتے، کوئی فکری بات کیا عرض کریں۔ ہاں جب وہ کوئی "فکری" بات سامنے لائیں گے، تو ہم بھی کچھ عرض کریں گے۔ اس وقت وہ ایک خاص سیاسی اور کارپوریٹ ایجنڈے کو مذہب کی آڑ میں جس طرح آگے بڑھا رہے ہیں، اسے دیکھنے کی ضرورت ہے، اور وہ یہ ہے کہ اسلام کا اپنا کوئی موقف یا شناخت ہی باقی نہ رہے اور ہر جدید اور مغربی موقف کو "اسلامی" کہا جانے لگے۔ سادہ لفظوں میں یہ ایجنڈا مذہب ہی کا خاتمہ ہے اور آنجناب کی پالیسی سے یہ غیر معمولی طور پر مؤثر ہو گیا ہے۔

فکر اور پالیسی میں ایک بنیادی فرق یہ ہوتا ہے کہ فکر کا ایک narrative اور اس کے discourses ہوتے ہیں، ان کا جواز فکر کے meta-narrative سے حاصل ہوتا ہے۔ جبکہ پالیسی کا narrartive اور meta-narrative کوئی ہوتا ہی نہیں، ایک ایجنڈا ہوتا ہے جس کی لازمی ترین

شرط اس کا اخفا ہوتا ہے۔ پالیسی اسی اخفا سے پیدا ہوتی ہے، اور ہمارے متجددین کا اپنے meta-narrative کو اخفا میں رکھنا ہی ان کی ''فکر'' کو لیجنڈا اور طریقۂ کار کو پالیسی بنا دیتا ہے۔ پالیسی کی تمام articulation سے لیجنڈا محذوف ہوتا ہے۔ اس پالیسی کو کبھی doctrine، کبھی new deal، کبھی plan، کبھی humanitarian mission، کبھی progressive ideas وغیرہ کہہ کر متعارف کرایا جاتا ہے۔ آنجناب نے کمال بندہ نوازی سے اسے ''صحیح اسلامی فکر'' قرار دیا ہے۔ اگر پالیسی کو اس طرح کا جھنڈا نہ تھمایا جائے تو کوئی سننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ لیجنڈے کو آگے بڑھانے کے لیے پالیسی پینترے بدلتی رہتی ہے، اور خود لیجنڈا ہمیشہ اخفا میں رہتا ہے۔ اگر دنیا میں تیسرے درجے کے کسی فکری آدمی سے بھی کوئی پوچھے کہ جمہوریت کیا ہوتی ہے تو وہ اس کی فکر کا جیسا تیسا ایک باقاعدہ بیان سامنے لانے کی کوشش کرے گا۔ جمہوریت سیاسی طاقت کا اور سیاسی طاقت سے قائم ہونے والا ایک نظام ہے اور اس کی مقوم فکر عقلی اور نظری پیراڈائم میں کام کرتی ہے، یعنی اس کے دلائل ہرگز مذہبی نہیں ہیں۔ اگر ہم آنجناب سے پوچھیں کہ ''جمہوریت کیا ہے'' تو وہ انگلی اٹھا کے فرمائیں گے کہ قرآن مجید کی فلاں آیت میں پائی جاتی ہے۔ یعنی اہل مغرب نے بڑی محنت سے، تین سو سال لگا کے ایک سیاسی نظام بنایا جسے وہ جمہوریت کہتے ہیں، اور کیسا حسن اتفاق ہے کہ وہ قرآن مجید کی ایک آیت کے عین مطابق نکلا۔ قرآن مجید پر صدیوں کی تحقیق کے باوجود اہل مغرب کو ہوا تک نہ لگی کہ وہ جو اتنا بڑا اور تہذیبی کام کر بیٹھے ہیں وہ تو عین اسلام اور قران مجید کے مطابق ہے۔ اس ''دریافت'' کا شرف چونکہ آنجناب کی ''صحیح اسلامی فکر'' کو حاصل ہونا تھا، اس لیے انہوں نے مسلمانوں پر مہربانی فرمائی کہ اس کا اظہار کر دیا، ورنہ بے چارے مسلمان تو اندھیرے میں رہتے۔ اور اگر پوچھیں کہ ریاست کیا ہوتی ہے تو فرمائیں گے کہ وہ تو کسی آیت میں نہیں پائی جاتی، اگر پوچھ لیں کہ بیوروکریٹ کیا ہوتا ہے، تو فرمائیں گے کہ ہاں یہ تو ''اولی الامر'' والی آیت میں پایا جاتا ہے۔ اگر پوچھ لیں کہ ''فکر'' کیا ہوتی ہے تو آنجناب آیات کو صحافت اور کلچر میں در آنے والے جدید مغربی الفاظ اور اصطلاحات کا سابقہ لاحقہ بنا کر ایک شماریاتی جدول بنا کر پیش فرماتے ہیں۔ اور اگر پوچھیں کہ ''اسلامی فکر'' کیا ہوتی ہے تو آنجناب کی طرف سے رازیؒ، غزالیؒ اور دیگر مسلمان مفکرین کی طلبی اور ڈانٹ شروع ہو جاتی ہے۔ اگر پوچھ لیں کہ ''صحیح اسلامی فکر'' کیا ہوتا ہے یا ہوتی ہے، تو آنجناب اس کی نمائندگی کے جملہ حقوق فوراً اپنے آپ کو منتقل کر لیتے ہیں۔ آنجناب کی فکر کوئی مربوطی قسم کی چیز ہے جو ہر مغربی فکر یا ادارے کو قرآن مجید کی فلاں آیت سے جوڑتی ہے، یعنی اس کا جوڑنے کا کام تو ظاہر ہے، لیکن خود اس فکر کا بیان کیا ہے جس سے وہ اس نتیجے پر پہنچتی ہے، اس کے جواب میں وہ آپ کو ''اسلامی'' کہہ کے خاموش کرانے کی کوشش کریں گے۔ یعنی یہ فکر کچھ دعاوی

کا نام ہے جن کا اطلاق تو ہے لیکن بیان کوئی نہیں ہے۔ پالیسی کا طریقۂ کار بھی یہی ہوتا ہے۔ بہر حال یہ خاصی عجیب قسم کی فکر ہے، کیونکہ یہ فکر مندی سے پیدا ہوئی ہے کہ کوئی مغربی فکر یا ادارہ ''اسلامی'' ہونے سے رہ نہ جائے۔

کیا یہ بات اب کوئی راز ہے کہ پوری دنیا مذہب کو اپنی نجی، انفرادی، سماجی، معاشی اور سیاسی زندگی سے بے دخل کر چکی ہے۔ عصر حاضر کی شعبِ ابی طالب میں گھرے ہوئے بے چارے مسلمان ابھی تک مان کے نہیں دے رہے۔ اب اسلام کا ریاست سے تعلق ہو یا نہ ہو، صرف یہ نعرہ ہی بلند کر دینا کہ اسلام کا ریاست کے کوئی تعلق نہیں ہوتا، یا خلافت کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے، ایک بہت بڑی مذہب دشمن فتح ہے۔ باقی کام کلچر، میڈیا اور عصری حالات مکمل کر دیتے ہیں، کیونکہ وہ پہلے بھی تو یہی کام کر رہے ہیں، وہ کوئی صدر اول کا معاشرہ تھوڑی تشکیل دے رہے ہیں۔

''پالیسی'' اور ''فکر'' کی توسیط میں ایک جوہری فرق یہ ہے کہ ''فکر'' کی توسیط کا دائرہ کار علمی ہے اور ''پالیسی'' کی توسیط کا دائرہ کار میڈیائی ہے۔ آنجناب کے تمام فکری قضایا عقلی طور پر بالکل بے وقعت ہیں، لیکن پالیسی کے طور پر انتہائی مؤثر ہیں۔ پھر فکر میں یہ استعداد ہوتی ہے کہ وہ عصری سیاسی فضا میں اپنی معروضی حیثیت کو کسی نہ کسی حد تک باقی رکھ سکے، لیکن ''پالیسی'' کا سیاسی اور ثقافتی رووں کے ساتھ ہم قدم ہونا ضروری ہے۔ فکر کا دائرہ کار محدود ہوتا ہے، لیکن پالیسی عامۃ الناس سے مخاطب ہوتی ہے۔ فکر میں سچ یا حق اہم ہوتا ہے، پالیسی میں مقبولیت، media rating، اور فوری کامیابی اہم ہوتی ہے۔

فکر اور پالیسی میں نسب کا مسئلہ نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ پالیسی بے نسب ہوتی ہے اور فکر ہر موضوع پر غلط اور صحیح مواقف کو بھی محفوظ رکھتی ہے، فکر حالات کے مطابق اپنا موقف تبدیل نہیں کرتی، اگرچہ فکری معاملات میں طاقت کے ترجیحات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ ترجیحات بھی دلائل بن کر سامنے آتی ہیں۔ پالیسی سیاسی بیانات کو ادل بدل کرنے سے آگے بڑھتی ہے۔ یہ تو معروف ہی ہے کہ آنجناب ''صحیح اسلامی فکر'' پر استوار اپنا ''دینی موقف'' بار بار بدلنے کی حیرت انگیز صلاحیت رکھتے ہیں۔ فکر میں دوامی پہلو موجود ہوتے ہیں، اور موضوع کا استقلال ایک معمول ہے کیونکہ فکر ایک پس منظر سے جڑی ہوتی ہے، یعنی آج بھی ریاست کی کوئی فکری گفتگو افلاطون کے بغیر شروع بھی نہیں ہوتی۔ پھر یہ کہ فکری گفتگو دلیل اور رد دلیل سے آگے بڑھتی ہے۔ آنجناب کی ''فکر'' عین انہی قضایا کو جو رد مذہب کے لیے بنائے گئے آیات کے سائبان میں آگے بڑھاتی ہے، اور یہ کمالِ ہنر پالیسی سے حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً حیاتیات میں ارتقا کی تھیوری کا اصل مقصد ہی اللہ تعالیٰ کی خالقیت کے مذہبی عقیدے کو ختم کر کے اس کا متبادل فراہم کرنا تھا۔ بعد میں یہ نظریہ حیاتیات سے پھیل کر مغربی تہذیب کا اساسی نظریہ بن

گیا۔ ہمارے ہاں یہی نظریہ "منصوص" ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے مرحلے میں اگر یہ "منصوص" ہو جائے تو اگلے مرحلے میں "منصوص" کی چپپی اتارنا آسان ہو جاتا ہے۔ یہی معاملہ جمہوریت اور دیگر سماجی اداروں اور علوم کا ہے۔

پالیسی میں پیش منظر اور اس میں survival اہم ہوتی ہے، اور وہی بات کہی جاتی ہے جو عوام سننا چاہتے ہیں۔ اگر ہم کہیں کہ مغرب اور اسلام باہم یک نگر (mutually exclusive) ہیں، تو لوگ یہ بات سننا نہیں چاہتے، کیونکہ خاص تاریخی حالات کی وجہ سے ہمارے خوابوں کا مرکز اور واقعاتی زندگی کا definer مغرب ہے۔ ہم تاریخی اور فکری شعور کو کام میں لاتے ہوئے ان مسائل و حقائق کو زیر بحث لا سکتے ہیں، لیکن نتائج سے حالت انکار میں ہیں، اور انہیں صرف اسلامی کہنا چاہتے ہیں۔ یہ کام کوئی معلومہ فکر تو نہیں کر سکتی، ہاں پالیسی یہ شعبدہ دکھا سکتی ہے۔ پالیسی جو ہو چکا یا ہونے والا ہے اس سے ہمقدم ہوتی ہے، لیکن فکر ہو چکی اور ہونے والی چیزوں کا پورا شعور رکھتے ہوئے ان کے تابع نہیں رہتی اور ایک علمی تناظر بنانے کی طرف مائل ہوتی ہے۔ پالیسی بیانات پر چلتی ہے، فکر تجزیے کرتی ہے۔ اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ "بیانیہ" دراصل ایک بیان ہے، جو ان کی مذہب کے بارے میں پالیسی کو ظاہر کرتا ہے، کسی فکر وغیرہ کا حامل نہیں ہے۔

متجددین اور "اسلام اور ......" کی منہج

ہم نے اس ذیلی عنوان میں "اسلام اور" کے بعد خالی جگہ چھوڑی ہے تاکہ استشراقی مواقف اور استعماری اشیر باد پر پلنے والی دیسی مذہبی فکر کی تزویراتی حکمت عملی کی طرف توجہ دلائی جا سکے۔ ہمارے ہاں تمام جدید افکار اسی "اسلام اور......" کا جھنڈا اٹھا کے داخل ہوئے ہیں۔ اب اس خالی جگہ کو آپ دس ہزار ناموں میں سے اپنی پسند کے نام سے پر کر لیں اور خامہ فرسائی شروع کر دیں۔ ہمارے ہاں نام نہاد متجددانہ علم کا یہ standard طریقۂ کار ہے۔ اس میں چونکہ "اسلام" کا ذکر پہلے آتا ہے اور آیتوں اور حدیثوں کو حوالہ در حوالہ درج کر کے اور پانچ دس دفعہ اس چیز کا ذکر کر کے جس پر اسلام کو لاگو کرنا ہوتا ہے یا جسے رخصت دینی ہوتی ہے، ایک نتیجہ نکال لیا جاتا ہے اور جدید فکر آگے بڑھتی رہتی ہے۔ آپ کو کبھی یہ عنوان نہیں ملے گا کہ "ریاست اور اسلام"، کیونکہ اس میں ریاست پر علوم کے طے کردہ، اور پہلے سے موجود مباحث میں رہتے ہوئے نظری گفتگو کرنا پڑتی ہے، جو ہمارے متجددین کے لیے ممکن نہیں ہے۔ ریاست جدید سماجی اور فلسفیانہ علوم کا بہت بڑا مبحث ہے، جو ایک بہت طویل تاریخ بھی رکھتا ہے۔ یہ افلاطون کی جمہوریہ سے شروع ہوتا ہے اور اس کا آخری بڑا نمائندہ ہابرماس ہے۔

اپنی پوری تاریخ میں یہ مبحث نظری اور عملی پہلوؤں کو ایک لمحے کے بھی الگ نہیں ہونے دیتا، اور یہ کوئی مذہبی مبحث بھی نہیں ہے۔ صاحب بیانیہ جس ریاست کا ذکر فرمارہے ہیں، وہ یہی جدید ریاست ہے جو ہمارے ہاں اپنی ساخت اور فعلیت میں مغربی ہونے کے ساتھ ساتھ استعماری بھی ہے۔یہاں ضمناً عرض ہے کہ یورپ میں بننے والی جدید "ریاست" اور نوآبادی میں کھڑی ہونے والی جدید "ریاست" میں نہایت بنیادی امتیازات ہیں، جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ ہم صرف یہ عرض کر رہے ہیں کہ آنجناب جس ریاست کا ذکر فرمارہے ہیں کیا وہ اس کے "فکر" سے واقف ہیں؟ یہ سوال اس لیے ضروری ہے کہ آنجناب خود اسلام کے "فکر" کی نمائندگی فرمارہے ہیں، تو جدید ریاست سے جڑی ہوئی فکر بھی بیان ہونی چاہیے۔ ریاست ایک "واقعاتی حقیقت" ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہت اہم فکری اور علمی مبحث بھی ہے اور اس پر آنجناب یہ کہہ کر کام نہیں چلا سکتے کہ "ریاست کا کوئی مذہب نہیں ہوتا"[۱۷]۔ مثلاً اگر کوئی یہ کہے کہ موٹر وے کا کوئی مذہب نہیں ہوتا تو اس سے بھلا کس کو اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن کیا موٹر وے سے وابستہ انسانی ضروریات اور مطالبات اس بیان سے پورے ہو جاتے ہیں؟ کیا ریاست کی طرح موٹر وے کے بارے میں صرف یہ جاننا ضروری ہے کہ اس کا کوئی مذہب ہوتا ہے یا نہیں، یا کچھ اشد ضروری معلومات اس کے علاوہ بھی درکار ہیں؟ اگر ریاست کا کوئی مذہب نہیں ہوتا تو یہ سوال باقی رہتا ہے کہ اس کا اور کیا کیا ہوتا ہے؟ یا جسے "اسلام کا صحیح فکر" کہا جا رہا ہے وہ یہ جاننے کی اجازت نہیں دیتا؟ افلاطون تو مذہبی آدمی نہیں تھا، لیکن ریاست کا سوال اس کے نزدیک اہم ہے، کیونکہ کسی انسانی معاشرے کا طاقت کے نظام یا حکومت کے بغیر تصور بھی قائم نہیں کیا جا سکتا، اور مثالی معاشرے کا نظریہ بیان کرتے ہوئے وہ حکومت اور طاقت کے نظام کی تفصیل کے لیے جمہوریہ لکھتا ہے۔ ریاست کے بارے میں یہ کہنا کہ اس کا کوئی مذہب نہیں ہوتا بالکل ایسے ہی ہے کہ ایک آدمی

۱۷۔ جدید عہد میں یہ بات تو بہت ساری ایسی چیزوں کے بارے میں کہی جا سکتی ہے جنھوں نے معاشرت اور فطرت دونوں کو تبدیل کر دیا۔ تنظیم یعنی آرگنائزیشن نے انسانی معاشرت کو سرے سے ختم ہی کر دیا ہے اور اس پر ماہر عمرانیات ولیم وائٹ کی *The Organization Man* ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ مشین اور ٹیکنالوجی نے فطرت (natural world) کو بالکل ہی بدل کر رکھ دیا۔ یورگن ہابرماس نے اپنی کتاب (*The Philosophical Discourse of Modernity*) میں ایک بہت حیرت انگیز بات لکھی ہے کہ اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں ریلوے کے نظام نے یورپی انسان کے زمانی اور مکانی ادراک کو جڑوں تک بدل کر دیا، اور اس موضوع پر ہونے والے مطالعات کی کثرت کا ذکر کیا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ریاست کی طرح، ریلوے کا بھی کوئی مذہب نہیں ہے لیکن اس بدیہی تبدیلی کو کس طرح دیکھیں گے؟ یہ اس لیے ضروری ہے کہ انسان کے زمانی اور مکانی ادراک کو تبدیل کرنے سے مراد ہے انسان کی شرائطِ ہستی کو تبدیل کر دینا، اور یہ تبدیلی ان مطالبات سے زیادہ گہری ہے جو مذہب انسان سے رکھتا ہے۔ اگر مذہب انسان سے نفسی، اخلاقی اور روحانی تشکیل کے کچھ مطالبات رکھتا ہے اور جدیدیت اپنے افکار، اداروں اور ٹیکنالوجی کے ذریعے انسان کی نفسی، اخلاقی، روحانی اور وجودی تشکیل ہی کا داعیہ رکھتی ہے تو اس میں کیا یہ دیکھنا غیر ضروری ہے کہ مذہب اور جدیدیت کے مطالبات ایک جیسے ہیں یا ان میں کوئی فرق بھی ہے؟

ریلوے لائن پر بیٹھ کر آتے ہوئے انجن کے بارے میں یہ کہے کہ اس کا کوئی مذہب نہیں ہوتا تو آپ کیا فرمائیں گے؟ کیا اس وقت میرا انجن سے واحد مطالبہ یہی ہے کہ میں یہ معلوم کروں کہ اس کا کوئی مذہب ہوتا ہے یا نہیں؟ جدید معاشروں کی ترقیاتی لائن پر ریاست اسی طرح کا انجن ہے۔ یہ "فکر" کی وہی سطح ہے کہ کوئی آدمی ہاتھی پر ایک بیانیہ لکھے اور اس میں یہ کہے کہ ہاتھی کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا لہٰذا ثابت ہوا کہ ......، تو لہٰذا کیا ثابت ہوا؟ یہی کہ ہاتھی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا؟!

"اسلام اور ......" کے منہج علم میں ایک نہایت اہم چیز کار فرما ہوتی ہے کہ اسے ایک "طے شدہ" اور "غیر طے شدہ" چیزوں کے درمیان تعامل کو پہلے سے طے شدہ ایجنڈے کے مطابق بھگتایا جاتا ہے۔ اس میں "طے شدہ" اور "غیر طے شدہ" کا مطلب وہی ہے جو آقاے سرسید کا تھا کہ استعمار اور مغرب کی بالادستی چونکہ تاریخی طور پر مسلم، طے شدہ امر ہے جو اللہ تعالیٰ کے اذن اور منشا کے بغیر واقع نہیں ہو سکتا تھا، لہٰذا یہ عین حق ہے اور ہمارے پیارے دین اسلام کی بھی یہی مراد ہے، اور یہ مراد ہماری "نصوص" سے بھی ثابت ہے۔ یعنی مغرب اپنے غلبے اور تصور حیات میں اب طے شدہ ہے اور نئے حالات میں اسلام "غیر طے شدہ" ہے، اس لیے نئے حالات میں اس کا "طے" ہونا ضروری ہے۔ آقاے سرسید نے تو سب مغربی اور استعماری چیزوں کو "نصوص" سے ثابت کر دیا تھا، لیکن مسلمان ایسے "کوڑھ مغز" ہیں کہ ان کو سمجھ ہی نہیں آتی، اس لیے اعادے کی بہت ضرورت پڑتی ہے، جیسے کہ صاحبِ بیانیہ نے وہی پرانی "اوری منہج" استعمال میں لا کر اعادہ فرمایا ہے اور "ناشناس نہ ای" بھی ساتھ فرمایا ہے۔ ان کے ہاں بھی جدید، استعماری اور نوآبادیاتی ریاست چونکہ قائم ہو گئی ہے، ایک تاریخی حقیقت ہے، ایک واقعاتی امر ہے، اس لیے اسلام کو طلب کر کے پوچھنا چاہیے کہ یہ "اور" کیا چیز ہے۔ اسلام سے جواب طلبی کی ایک مزید شرط یہ ہے کہ یہ either/or میں جواب دے گا۔ یعنی یا یہ اسلامی ہے یا غیر اسلامی۔ یہ طاقت کی زبان ہے، یہ قانون کی زبان ہے، فتوے کی زبان ہے، فکر کی زبان نہیں ہے۔ آنجناب کی فکر خاموش ہے، ان کا فتویٰ جاری ہے[18]۔ استعمار اس طرح کی either/or علم سے باہر طاقت کی دنیا میں روز

18۔ یہاں تاریخی حالات کی ایک گہری ستم ظریفی کی طرف اشارہ نہ کرنا تسامح ہو گا۔ سرسید عالم تھے، عالم دین نہیں تھے۔ انہوں نے جب استعماری جدیدیت کو "اسلام" کے نام پر پیش کرنے کا فیصلہ کیا، تو ہر چیز کو مفصل بیان کیا، اور طرح طرح کی علمی چابک دستی سے وہ ہر استعماری چیز کو عین اسلامی بناتے چلے گئے۔ ان کی فکر اور تحریر عوام کے لیے بہت accessible تھی۔ ان کے جواب میں ہمارے مذہبی علما اپنے پرانے انداز میں فتوے دیتے رہے، جنہیں سرسید "گوز شتر" قرار دیتے تھے۔ ہمارے علما میں سرسید کی فکر پر نقد لانے والا کوئی نہیں تھا۔ پھر روح عصر بھی سرسید کے ساتھ تھی، اور ان کا موقف قائم ہو گیا۔ آنجناب مذہبی عالم ہیں۔ ان کے ہاں سرسید کی منہاج اور مذہبی مزاج ایک ہو گئے ہیں۔ یہ اپنے فتوے کو فکر کہہ کر آگے بڑھا رہے ہیں، کیونکہ انہیں اندازہ ہے کہ لوگ اب مذہبی بات سننے میں کم دلچسپی رکھتے ہیں، اس لیے مذہب کو فکر بنا کر وہ کام چلا رہے ہیں۔ لیکن اس میں خطرناک پہلو یہ ہے کہ اب سرسید کی فکر مذہب کے قلب سے فتوے کے طور پر نمودار ہو رہی ہے۔

واقع کرتا ہے۔ ۲۰۰۱ء کی either/or کسے یاد نہیں؟ اب ایک ہی آیت پڑھ کے جمہوریت اگر مشرف بہ اسلام ہو سکتی ہے تو ریاست بیرون از اسلام کیوں نہیں ہو سکتی؟ اب جدید ریاست اور جمہوریت اپنے پیچھے ایک بہت ہی وسیع فکر رکھتی ہیں جو تاریخ اور معاشرے کی حرکیات سے لے جدید تنظیمی ریاست کی وجودیات کو محیط ہے۔ ہم اس فکر کے اچھا برا، صحیح غلط ہونے کی بحث میں پڑے بغیر صرف یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ ایک آیت پڑھ کر اس فکر سے کیونکر اغماض برتا جا سکتا ہے؟ جدید ریاست کی فکر ہمیں بتاتی ہے کہ یہ مغرب کے تصور حیات ہی کا ایک تہذیبی مظہر ہے۔ اور اگر مغرب کے تصور حیات اور اسلام میں کوئی تضاد یا فرق نہیں ہے تو پھر آیتوں کا ورد کر کے چیزوں کو مشرف بہ اسلام کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے، سب تو اسلامی ہی اسلامی ہے۔

اگر ہم برصغیر میں گزشتہ دو سو سال کی اپنی "فکری" تاریخ کا جائزہ لیں تو اس اوری منہج میں ہونے والی گفتگو کا نتیجہ عین وہی نکلتا ہے جو استعمار، یا استشراق یا جدیدیت چاہتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیا "صحیح اسلامی فکر" میں اتنی سکت یا دیانت ہے کہ وہ مغرب کی فکری تشکیلات اور ان کی بنیاد پر ہونے والے تہذیب کے ادارہ جاتی قیام پر کوئی فکری روزن کھول سکے؟ ہم تھوڑی دیر کے لیے یہ بات مانے لیتے ہیں کہ کسی غزالیؒ، رازیؒ وغیرہ کو یہ اختیار نہیں کہ وہ کسی چیز کے دینی یا غیر دینی ہونے کا فیصلہ کریں، اور آنجناب ان کو ڈانٹ بھی اسی لیے پلاتے ہیں کہ وہ اپنے اختیار سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ ان بیچاروں کو تو یہ بھی اجازت نہیں کہ وہ کسی اصطلاح کے دینی یا غیر دینی ہونے کی بات کر سکیں۔ لیکن فکر کا معاملہ تو اصطلاح سے آگے کی چیز ہے۔ یعنی رازیؒ اور غزالیؒ کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی اصطلاح کو دینی یا غیر دینی کہہ سکیں اور آنجناب کو وہ تمام اختیارات اور جملہ حقوق حاصل ہیں جن کی بنیاد پر وہ ایک پوری استعماری فکر کو "صحیح اسلامی فکر" قرار دے سکتے ہیں۔ صاحبِ بیانیہ نے ایک فکر بنائی، پھر اسے خود ہی "صحیح" قرار دے لیا، اور پھر وہ "اسلامی" بھی ہو گئی، اور پھر اس کا ہر چیز پر اطلاق بھی ہونے لگا۔ اس کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس "فکر" کا مبسوط بیان کہیں نہیں ہے۔ ان کی تحریروں میں یہ innuendo کے طور پر موجود ہوتی ہے، بس یہ اطلاق میں حد درجہ سرگرم ہے، فلاں اسلامی، ڈھماں غیر اسلامی، فلاں یہ ڈھماں وہ۔ متجددین میں اتنی دیانت اور صلاحیت ہی نہیں ہے کہ وہ کسی فکری موضوع کو زیر بحث لا سکیں۔ یہ طریقۂ کار دراصل پورے دین اور دینی روایت ہی کو منہدم کرنے کا وہ منصوبہ ہے جو "جدید اسلام" کے عین قلب سے برآمد ہو رہا ہے، اور اب کی بار اس کے خطرات فزوں تر ہیں۔

جدید "ریاست" اور قانون

ہم اس مضمون میں جدید ریاست کی مقوم فکر کی بحث فی الحال نہیں چھیڑ رہے، کیونکہ قطعی الدلالہ کے

مسئلے پر ناچیز نے آنجناب کی "فکری" کارگزاری دیکھی ہوئی ہے۔ آنجناب فکری تشکیلات سے زیادہ نعرے اور سلوگن بنانے میں مہارت رکھتے ہیں[19]۔ یہاں چند ضروری امور کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ ہم صرف اس بات کا جائزہ لے رہے ہیں کہ اگر متجددین کو خالص مذہبی اور جدید مباحث کو بیک وقت لے کر چلنا پڑے تو وہ کن چیزوں کو آگے بڑھاتے ہیں اور کیا کیا چیزیں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جدید ریاست کے حوالے سے پہلی بات یہ ہے کہ یہ پوری انسانی تاریخ کا واحد حاوی حیات مظہر ہے، جس نے فرد اور اجتماع کی حیات کلی کو اپنی وجودی اور اقتداری ترجیحات پر متعین کیا ہے اور شرائط ہستی اور شرائط حیات کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا ہے۔ "حاوی حیات" کہہ کر ہم یہ عرض کرنا چاہ رہے ہیں کہ جدید ریاست سیاسی طاقت اور معیشت کی ایسی deployment ہے جو معاشرے، تاریخ اور فطرت کی تمام spaces پر غالب آ کر ان پر متمکن ہو جاتی ہے۔ انسانی فرد اور اجتماع کو طاقت کے علاوہ کوئی space فراہم نہیں رہتی، اور وہ مکمل طور پر اس میں embed ہو جاتے ہیں۔ یعنی جدید سیاسی طاقت انفسی اور آفاقی حیات کے تمام مظاہر پر مکمل غلبہ رکھتی ہے، اور یہ غلبہ بندوقی سے زیادہ حضوری ہے۔ انفس و آفاق میں سیاسی طاقت کی مستقل presence کی وجہ سے کوئی چیز اس سے باہر اپنا وجود باقی نہیں رکھ سکتی[20]۔

سیاسی طاقت اور قانون کا تعلق تو قدیمی ہے، اور طاقت کے بغیر قانون متصور نہیں ہو سکتا، کیونکہ قانون کا اصولِ حرکت سیاسی طاقت ہے۔ اس لیے مذہبی یا غیر مذہبی قانون کی ہر گفتگو سیاسی طاقت کی بحث کے بغیر بے معنی ہے۔ ہم یہاں جدید اور قدیم سیاسی طاقت اور ان کے قانون سے تعلق کے بارے میں ایک پہلو کو سامنے لانا چاہ رہے ہیں۔ قدیم سیاسی طاقت میں قانون کا تعلق انسان کے افعال سے تھا، اور جدید سیاسی طاقت میں قانون کا تعلق افعالِ انسانی اور وجودِ انسانی دونوں کو محیط ہے۔ روایتی قانون کا دائرہ "کرنا" کو محیط تھا، جبکہ جدید قانون "کرنا" اور "ہونا" دونوں کو محیط ہے۔ جدید قانون کے دو پہلو ہیں:

انتظامی: یہ نفاذی پہلو ہے۔ جدید قانون ریاست کی کارکردگی متعین کرتا ہے، اور اس کارکردگی کو جواز فراہم کرتا ہے۔ اپنے انتظامی پہلو میں یہ انسانوں کے افعال پر وارد ہے۔ فرمانروائی کا تعلق قانون

۱۹۔ تصوف متوازی دین ہے، خلافت اسلامی اصطلاح نہیں ہے، لفظ کا مدلول قطعی الدلالہ ہے، مشاورت جمہوریت ہے، سرمایہ داری عین فطرت ہے اور اسلام عین فطرت ہے، لہٰذا کوئی فرق نہیں، وغیرہ وغیرہ۔

۲۰۔ presence یا حضور دراصل انفسی چیز ہے، آفاقی نہیں ہے۔ جدید سیاسی طاقت ایک ایسا حاوی حیات عمل، مظہر اور process ہے جو آفاق یعنی natuarl world میں ایک دائمی presence حاصل کر لیتا ہے۔ سیاسی طاقت کا دنیائے آفاق میں حضور حاصل کر لینا ایک شعبداتی چیز ہے، جو دراصل آرگنائزیشن، ٹیکنالوجی اور مستقل surveillance سے ممکن ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید سیاسی طاقت نے قانون کو ان spaces تک وسعت دے دی ہے جو بنیادی طور اخلاقی تھیں، اور جدید تعلیم کے ذریعے یہ نفس اور ذہن کی تشکیل کے تمام مؤثرات کو بھی اپنے کنٹرول میں لا چکی ہے۔

کے اسی پہلو سے ہے۔ جدید ریاست میں قانون کی منہجِ نفاذ تنظیمی ہے اور صرف یہی پہلو جدید ریاست اور سیاسی طاقت کی روایتی اور قدیم تشکیل میں بہت بنیادی نوعیت کے فروق پیدا کر دیتا ہے۔

وجودی: یہ نفوذی پہلو ہے۔ جدید قانون کا یہ پہلو زیادہ اہم، گہرا، ہمہ گیر، سرایتی اور حاوی حیات ہے۔ جدید قانون دراصل انسان اور اس سے وابستہ تمام اشیا کا جوازِ وجود اور اسلوبِ وجود، یعنی ہستی اور حیات، دونوں کو متعین کرتا ہے۔ فطرت، تاریخ اور معاشرے میں کوئی شے اس سے باہر نہیں ہے۔ جدید عہد میں چیزوں کے وجود، اسلوبِ وجود اور عدم کا فیصلہ ریاست کا اختیار ہے، فطرت یا تاریخ کے وظائف نہیں ہیں۔ جدید طاقت اور قانون کا یہی وہ پہلو ہے جس میں یہ فطرت اور تاریخ پر اپنا غلبہ مکمل کر کے اپنے علاوہ ہر دوسری چیز کو عدم کی طرف جلاوطن کر دیتی ہے۔ قانون افعالِ انسانی پر حکم ہے، لیکن جدید قانون افعالِ انسانی اور وجودِ انسانی دونوں کا مقوم اور ان پر حکم ہے۔ انٹرنیٹ کی آمد کے بعد قانون کی یہ رسائی انفس تک مؤثر ہو گئی ہے۔ جب ہم قانون کہتے ہیں تو اس سے مراد سیاسی طاقت ہی ہوتی ہے۔

یہاں فوری اہمیت کا سوال یہ ہے کہ جدید قانون انتظامی اور جوازی جہات سے آگے نکل کر وجودی ابعاد کیونکر اختیار کر لیتا ہے؟ جدید قانون کی انسان اور تمام متعلقاتِ انسان کی وجودی ابعاد تک رسائی کی وجہ یہ ہے کہ ماقبل جدید معاشروں میں انسان اور متعلقاتِ انسان کے تمام تعینات تاریخ اور فطرت کے وظائف تھے۔ جدید سیاسی طاقت اپنے سائنسی اور ٹیکنالوجیائی وسائل سے تاریخ اور فطرت پر غالب آ جاتی ہے اور جو چیز غلبے کے ذریعے سے سیاسی طاقت کی اقلیم میں داخل ہو جائے، اس تک قانون کی رسائی ممکن ہو جاتی ہے۔ مذہبی قانون کی بحث ہم عصر دنیا میں سیاسی طاقت اور قانون کے اس تناظر کو جانے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتی۔

”آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا“ اب پرانی بات ہے۔ عصر حاضر میں آدمی کے تشکیلی عناصر مکمل طور پر سیاسی طاقت یعنی قانون اور معاش سے فراہم ہوئے ہیں، یہاں تک کہ انسانی being اور becoming کا دائرہ کار اور اس کے لیے فراہم تمام وسائل سیاسی طاقت کے اختیارات ہیں۔ ایک مثال پیش خدمت ہے۔ جدید اہل علم کے ہاں یہ عام بات ہے کہ وہ تعلیم کو ایک political decision کہتے ہیں۔ مجھے شک ہے کہ آنجناب اس کا مطلب سمجھتے ہیں، کیونکہ اس میں تعلیمی آموزش اور استناد کی تہہ میں کارفرما SOLO Taxonomy بھی زیر بحث آئے گی، اور اس میں ہر قدم پر سیاسی طاقت اور قانون کے نقوش کندہ نظر آتے ہیں جو سیاسی ضروریات اور ترجیحات پر انسان کی پوری تشکیل کا لائحہ عمل ہے کیونکہ جدید تعلیم آدمی کو نئے سرے سے تخلیق کرنے کے سیاسی آلے اور عمل کا نام ہے، اور اس میں سے تقویٰ

تو دور کی بات ہے، پست ترین سطح کے اخلاقی مقاصد بھی مکمل طور پر خارج ہیں۔ میں کوئی فکری بات کر کے "صحیح اسلامی فکر" کو بدکانا نہیں چاہتا، لیکن دھڑکا لگا رہتا ہے یہ "فکر" پھر سے کوئی "دریافت" کر کے دین کی رسوائی کا سامان نہ کر دے۔

دوسری مثال لیجیے کہ اب آدمی کی تشکیل صرف شہری (citizen) کے طور پر ہو سکتی ہے۔ یہ ایک political construct ہے، یعنی "شہری" انسان ہی کی ایک قسم ہے جو mass production کے اصول پر بنائی جاتی ہے اور اس میں "انسان پن" کا مکمل ترین content سیاسی طاقت ہی متعین کرتی ہے۔ اہل علم تو واقف ہی ہیں کہ citizen ہی کا دوسرا نام political animal ہے۔ مثالوں کی فہرست بہت طویل ہے اور ہستیِ انساں اور حیاتِ انساں کو محیط ہے، لیکن افسوس تو یہ ہے کہ فکری مبحث میں مثالوں کی آمد و رفت شروع ہو جائے تو مثالیں ہی رہ جاتی ہیں اور فکر غائب ہو جاتی ہیں۔ حالت انکار میں پلی ہوئی "صحیح اسلامی فکر" کے نزدیک اس طرح کے مباحث کوئی وجود ہی نہیں رکھتے، اور اگر زور دیا جائے تو یہ فکر غضبناک ہو جاتی ہے۔ جدیدیت ایک فکر بھی ہے اور ایک واقعاتی صورت حال بھی ہے، اور اس میں فکر کا بیان اول ہے۔ فکر کو نظر انداز کر کے، واقعاتی صورت حال پر آیات پڑھ کر دم کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔

***